بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن

علمائے حیاتیات اور علم النفس، اس پر متفق ہیں کہ تحفظ (Self Preservation) کا جذبہ ہر ذی حیات میں، جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ جبلی جذبات میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی جذبہ کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی ہر متاع عزیز کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ جب انسانوں نے مل جل کر تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی، تو ان کے مفاد میں تصادم ہونے لگا۔ اس سے انہوں نے محسوس کیا کہ، انفرادی زندگی بسر کرنے سے، ان کی وہ چیزیں محفوظ نہیں رہ سکتیں جنہیں وہ اپنی متاع عزیز اور سرمایہ گراں بہا سمجھتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے۔۔۔ اجتماعی نظم ونسق کا تصور وضع کیا، جسے اب حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظم اجتماعی کا مقصد اولین یہ تھا کہ افراد کی وہ چیزیں محفوظ رہیں جنہیں وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

حقوق طبقہ حکمران کے:

حکومت کی بنیاد تو اس مقصد کے تحت رکھی گئی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آ گئی کہ حکمران طبقہ کے ہاتھوں لوگوں کا کوئی حق بھی محفوظ نہیں رہا۔ اس طبقہ نے تقسیم یوں کی کہ حقوق سب کے سب، ارباب حکومت کے ہیں اور ذمہ داریاں تمام کی تمام رعایا کی۔ لوگ اس تقسیم کو گوارا نہ کرتے لیکن مذہبی پیشوائیت آگے بڑھی اور یہ کہہ کر عوام کو اس تقسیم کے سامنے جھکا دیا کہ راجہ ایشور کا اوتار ہوتا ہے۔ بادشاہ خدائی حقوق (Divine Rights) کا حامل ہوتا ہے۔ سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے، اس لیے فرماں روائی اس کا حق اور اطاعت گزاری تمہارا فریضہ ہے۔ وہ جو کچھ تمہیں دے، اس کی عنایت اور احسان ہے۔

تم اس سے بطور حق کچھ نہیں مانگ سکتے۔ تم اس کے حضور جھکو۔ اسے سجدے کرو۔ اس کی خیریت کی دعائیں مانگو۔ اس کے ہر حکم کی اطاعت کرو، اور اس اطاعت کو اپنے لیے سرمایۂ ہزار سعادت سمجھو۔ تم اور جو کچھ تمہارا ہے، وہ اُس سب کا مالک ہے۔ اسے ان تمام چیزوں پر کلی اختیار حاصل ہے۔ وہ تمہارا ان داتا (رازق) اور پالن ہار (پروردگار) ہے۔ تم اس سے خیرات مانگ سکتے ہو۔ کوئی شے بطور حق کے طلب نہیں کر سکتے۔

حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا یہ تصور اسی طرح چلا آ رہا تھا کہ سترہویں صدی عیسوی میں، یورپ کے سیاسی نظریات میں ایک انقلاب آیا جس کی رو سے، اس تعلق کو از سر نو متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا یہ گیا ہے کہ ان دونوں (فریقوں) کا تعلق، ایک معاہدہ کی رو سے متعین ہونا چاہیے۔ اسے نظریہ میثاق (Contract Theory) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ:

1۔ تمدنی زندگی بسر کرنے سے پہلے انسان فطری حالت پر تھا۔

2۔ اس فطری حالت میں انسان کچھ حقوق رکھتا تھا جنہیں ہنوز کسی نے غصب نہیں کیا تھا۔

3۔ جب انسان کو اپنے فطری حقوق کے تحفظ کے لیے خطرہ لاحق ہوا تو اس نے معاشرتی زندگی اختیار کی۔ لہٰذا، معاشرہ (سوسائٹی) کا وجود، انسان کے فطری حقوق کے تحفظ کے جذبہ کا رہین منت ہے۔

4۔ بنابریں، معاشرہ کا فریضہ ہے کہ انسان کے فطری حقوق کا تحفظ کرے۔

5۔ ان فطری حقوق کا نام ہے۔ ''بنیادی حقوق انسانیت''

مغربی مفکرین کے نظریات:

اس نظریہ کا اولین داعی، یورپ کا مشہور مفکر ہابزؔ (Hobbes 1588-1679) تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ''اپنے حکم کو دوسروں سے منوانا، انسان کی فطرت میں داخل ہے۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی ''قیام امن'' بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے لیکن یہ دونوں باتیں یک جا نہیں رہ سکتیں۔ جب ہر فرد، اپنا حکم دوسروں سے منوانے پر تل جائے تو امن کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ لہٰذا،

انسان کو، اس دوسرے مقصد کے حصول کے لیے، اپنے پہلے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ بنابریں، ہابزؔ کے نزدیک، قیام امن انسان کا واحد بنیادی حق ہے جس کے لئے وہ اپنے ہر دیگر حقوق سے دستبردار ہوجاتا ہے۔

نظریہ میثاق کا دوسرا علمبردار لاکؔ (Locke 1632-1704) ہے۔ اس کے نزدیک، انسان کے بنیادی حقوق ''زندگی، صحت، آزادی، اور املاک'' ہیں ان کے تحفظ کے لیے انسان صرف، اپنا ایک حق چھوڑتا ہے، اور وہ ہے، متازعہ فیہ معاملات میں خود فیصلہ کرنے کا حق۔ لاکؔ کہتا ہے کہ افراد کو چاہیے کہ اپنے اس حق کو معاشرہ کے سپرد کردیں، اور اس کے بعد معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ افراد کے دیگر حقوق کا تحفظ کرے۔

چونکہ ہابزؔ اور لاکؔ کے ہاں، بنیادی حقوق کا تصور ان کے نظریہ میثاق کی ایک ذیلی شق کے طور پر آتا ہے، اس لیے یہ (تصور) کچھ ایسا واضح اور متعین نہیں۔ اسے، ایک جداگانہ اور مستقل نظریہ کی حیثیت سے (Tom Paine, 1739-1809) نے پیش کیا۔ جس کی کتاب (Rights of Man) آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس نے ''زندگی، آزادی، املاک، حفاظت اور استبداد کی روک تھام'' کو بنیادی حقوق انسانیت قرار دیا ہے۔ یہی تھے وہ حقوق، جنہیں، انقلاب فرانس کے بعد، فرانس کی نیشنل اسمبلی نے اپنے چارٹر میں درج کیا تھا امریکہ کا منشور آزادی (1774ء) بھی، پینؔ ہی کے فطری حقوق کے نظریہ پر مبنی تھا۔ اس میں زندگی اور آزادی کے ساتھ ''حصول مسرت'' کو بھی بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1918ء میں روس کی کانگریس نے مزدوروں اور کسانوں کے سلسلہ میں بنیادی حقوق کا ایک منشور مرتب کیا جس میں کہا گیا کہ ''اس منشور سے مقصود یہ ہے کہ ایک انسان، کسی دوسرے انسان کو لوٹ نہ سکے۔ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا جائے، اور تمام دنیا میں معاشرہ کی تشکیل، اشتراکی خطوط پر کی جائے۔''

مجلس اقوام متحدہ:

کوئی چالیس سال ادھر کی بات ہے، مجلس اقوام متحدہ (U.N.O) نے (Human

(Rights Commission) کے نام سے ایک تحقیقاتی بورڈ مقرر کیا تھا کہ وہ کامل غور وخوض کے بعد، سفارشات کرے کہ انسانیت کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ ان سفارشات کو (U.N.O) نے جانچا اور پرکھا اور اس کے بعد 1948ء میں وہ چارٹر شائع کیا جسے ''منشور حقوق انسانیت'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی اس کوشش کو، اس وقت تک اس باب میں حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ جو حقوق اس چارٹر میں درج ہیں، وہ مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

1۔ تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور بنیادی حقوق کے یکساں حقدار ہیں۔

2۔ زندگی، آزادی اور حفاظت جان کا حق۔

3۔ غلامی کی ممانعت۔

4۔ بے رحمی کے سلوک سے حفاظت کا حق۔

5۔ قانون کے معاملہ میں یکساں سلوک کا حق۔

6۔ کسی شخص کو بلا قصور گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ نہ نظر بند یا جلاوطن کیا جائے گا۔

7۔ جب تک الزام ثابت نہ ہو، ملزم کو بے قصور تصور کیے جانے کا حق۔

8۔ معاملاتِ زندگی اور خط وکتابت میں عدم مداخلت کا حق۔

9۔ نقل وحرکت کی آزادی۔

10۔ ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بسنے کی آزادی۔

11۔ حقِ قومیت۔

12۔ شادی کا حق۔

13۔ حقوقِ جائیداد۔

14۔ خیالات، ضمیر اور مذہب کی آزادی، نیز اظہار خیالات اور اجتماعات میں شرکت کی آزادی۔

15۔ اپنے ملک کی حکومت میں شرکت کا حق۔

16۔ تعمیر خویش کے لیے وسائل وذرائع کی آزادی۔

17۔ حسب منشاء کام کاج کی آزادی۔

18۔آرام اور فرصت کی آزادی، نیز معیار زندگی اور تعلیم کا حق۔

19۔جماعتی اور ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق۔

یہ ہے مختصراً ان حقوق کی فہرست جسے اقوام عالم کے نمائندگان نے اپنے۔۔۔مسلمہ چارٹر میں داخل کر رکھا ہے۔ان حقوق سے کن شرائط کے تحت بہرہ یاب ہوا جاسکتا ہے۔اس کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر کیا جائے گا۔سردست اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ اس فہرست کے بعد چارٹر میں یہ تحریر ہے کہ ان حقوق، اور اختیارات کو ان حدود کے تابع استعمال کیا جاسکتا ہے جو، مختلف ممالک میں از روئے قانون عائد کی جائیں۔۔۔چونکہ، اپنی اپنی منشاء کے مطابق قوانین سازی کا حق ہر ملک کو حاصل ہے، اس لیے ان قوانین کے تابع، ''بنیادی حقوق انسانیت'' کی جو حیثیت رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے۔۔۔

قرآن کا اعلان:

یہ ہے، اجمالی سا تذکرہ ان کوششوں کا جو انسان کے بنیادی حقوق متعین اور تسلیم کرنے کے سلسلہ میں، انسانی فکر نے آج تک کی ہیں۔اب ان کے مقابلہ میں اس ضابطہ حقوق کو سامنے لائیے جو چھٹی صدی عیسوی میں۔۔۔جب دنیا، انسان کے بنیادی حقوق کے تصور تک سے نا آشنا تھی۔۔۔تمام نوع انسان کی راہ نمائی کے لیے خدا کی طرف سے دیا گیا، اور جس پر عمل کر کے اس ضابطہ آسمانی کے لانے والے، پیغمبر آخر الزمان ﷺ نے، دنیا کو پہلی بار اس حقیقت کبریٰ سے روشناس کرایا کہ دنیا میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کے وہ حقوق کیا ہیں جنہیں دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ان حقوق کا تفصیلی تذکرہ، اس مختصر سے وقت میں مشکل ہے، اس لئے میں ان کے اجمالی تعارف پر ہی اکتفا کروں گا۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ (11:88)

اس مقام پر سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی فطرت (Human Nautre) کا تصور ہی غلط ہے۔انسان کی کوئی فطرت نہیں۔فطرت سے مراد ہوتی ہیں کسی چیز کی وہ خصوصیات جو اس شے کے اندر مضمر ہوں اور جنہیں نہ اسے بدلنے کا اختیار ہو اور نہ ہی ان

کی خلاف ورزی کی مقدرت۔ (مثلاً) حرارت پہنچانا آگ کی فطرت ہے۔ نشیب کی طرف بہنا پانی کی فطرت ہے۔ وہ نہ انہیں بدل سکتی ہیں نہ ہی ان کی خلاف ورزی کرسکتیں ان کے برعکس انسان کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لیے اس کی کوئی فطرت ہو نہیں سکتی۔ حیوانات کے کچھ طبعی تقاضے ہوتے ہیں، جنہیں۔۔۔ (Instincts) یا جبلّت کہا جاتا ہے۔ (یعنی وہ تقاضے جو جبل، پہاڑ کی طرح اپنے مقام پر اٹل اور محکم ہوں)۔ یہی تقاضے انسان کی طبعی زندگی (Physical Life) کے بھی ہیں۔ لیکن یہ ان کی خلاف ورزی بھی کرسکتا ہے مثلاً اپنی زندگی کی حفاظت کرنا، ہر ذی حیات کا جبلی تقاضا ہے جس کی خلاف ورزی کوئی حیوان نہیں کرتا۔ لیکن انسان خودکشی بھی کرسکتا ہے۔ بنابریں، انسان کے فطری حقوق کا تصور غلط ہے۔ چنانچہ اب مغرب کے مفکرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کیے جارہے ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ حیوانات کی طرح اس کی طبعی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں۔

حیوانات کے تقاضے تو ان کی طبعی زندگی کے تقاضوں تک محدود ہیں۔ لیکن انسان کے تقاضے، اس کے طبعی تقاضوں سے ماوراء بھی ہیں۔ مثلاً عزت نفس (Self Respect) کا تقاضا۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق طبعی زندگی سے نہیں، اس لیے حیوانات کو اس کا شعور تک نہیں ہوتا یہ خالص انسانی تقاضا ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ انسانی حقوق کا تعلق انسان کی طبعی زندگی کے تقاضوں سے بھی ہوگا اور اس کی انسانی زندگی سے بھی۔ جہاں تک اس کی طبعی زندگی کے تقاضوں کا تعلق ہے، ان کا معلوم اور متعین کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ان کا ہر انسان کو خود علم ہوتا ہے۔ لیکن انسانی تقاضوں کی یہ کیفیت نہیں۔ یہ نہ (جبلت کی طرح) انسان کے اندر ہوتے ہیں، اور نہ ہی متعین (مثلاً) جنسی اختلاط کا تقاضا طبعی زندگی سے متعلق ہے۔ اس کا ہر ایک کو علم ہوتا ہے۔ لیکن عصمت کی حفاظت کے تقاضے کی یہ کیفیت نہیں عصمت کا تصور مختلف اقوام میں مختلف ہے۔ یہ وجہ ہے جو انسانی فکر کی رد سے بنیادی حقوق انسانی کا کوئی عالمگیر چارٹر مرتب نہیں ہوسکتا اور اسی لیے اقوام متحدہ (U.N.O) کو ایک ماڈل چارٹر مرتب کرنے کے ساتھ ہی یہ کہنا پڑا کہ اس

پر عمل، ہر ملک اپنے اپنے قوانین کے تابع کرے گا۔

قرآن کریم تمام انسانوں کے لیے (عالمگیر) ضابطہ زندگی ہے اس لیے وہ بنیادی حقوق انسانیت کا ایسا منشور دیتا ہے جس میں انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضے بھی شامل ہیں اور اس کی انسانی زندگی کے تقاضے بھی جنہیں وحی کی رو سے متعین کیا گیا ہے اس کا اطلاق ان تمام اقوام پر یکساں ہوگا جو قرآن پر ایمان رکھتی ہوں۔ اس اعتبار سے یہ غیر متبدل۔ ابدی اور عالم گیر ہے۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد آگے بڑھئے۔

قرآنی نظریہ میثاق:

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ نظریہ میثاق، جسے عصر حاضر کی سیاسی فکر کا معرکہ آراء کارنامہ قرار دیا جاتا ہے، کا تصور بھی قرآن کریم ہی نے پیش کیا تھا لیکن وہ اس میثاق کو، حاکم اور محکوم میں استوار نہیں کرتا۔۔۔ اس کے نزدیک انسانوں میں حاکم اور محکوم کا تصور ہی باطل ہے۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا، اس کی رو سے، کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ وہ اس میثاق کو خدا اور بندوں کے درمیان معاہدہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اس میثاق کے لیے خدا خود بندوں کے سامنے نہیں آتا، اس لیے یہ میثاق افراد، اور اس معاشرہ کے درمیان طے پاتا ہے جو نظام خداوندی کو متشکل کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اسے خلافت یا قرآنی مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میثاق کے الفاظ یہ ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط (9:111)

افراد معاشرہ (مومنین) اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ دنیا میں نظام عدل واحسان کے قیام اور استحکام کی خاطر ان کا مال اور ان کی جان، نظام خداوندی کے سپرد ہوں گے اور نظام خداوندی ان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں، اس کے عوض ''الْجَنَّةَ ط'' عطا کرے گا۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ''الْجَنَّةَ ط'' میں وہ تمام خوش حالیاں اور خوش گواریاں۔۔ سرفرازیاں اور

سربلندیاں۔ اطمینان اور سکون۔ امن اور سلامتی۔ غرضیکہ وہ سب کچھ آجاتا ہے جس کی انسان آرزو کرسکتا ہے۔ اس میثاق کی رو سے، ان تمام چیزوں کا حصول، ان لوگوں کا بنیادی حق ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم نے جنتی معاشرہ کی جو تفاصیل بیان کی ہیں، اگر میں ان کا ذکر کروں تو اس سے ایک ایسی جامع فہرست مرتب ہوجائے گی جسے ان افراد معاشرہ کے بنیادی حقوق کا چارٹر سمجھا جائے گا۔ لیکن میں اس وقت، اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس لیے کہ یہ حقوق ان لوگوں کے ہوں گے جو اس میثاقِ خداوندی کا ایک فریق ہوں گے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور میرا موضوع، ان حقوق سے متعلق ہے جو قرآن کی رو سے دنیا کے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ یہ حقوق، کسی معاہدہ یا میثاق سے مشروط نہیں ہوں گے۔ نہ کسی خدمت کا معاوضہ۔ یہ بلا مشروط ہوں گے اور بلا مزد و معاوضہ، ہر انسان کو۔۔۔ بلا تخصیص مذہب، ملت، زبان، رنگ، نسل، وطن، محض انسان ہونے کی جہت سے حاصل ہوں گے۔ دیکھئے یہ حقوق کیا ہیں، جنہیں ہر انسان قرآنی معاشرہ سے، طلب کرسکتا ہے۔

1۔ احترام آدمیت:

پہلا حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) قرآن کا ارشاد ہے۔ یعنی ''ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔'' لہٰذا، پیدائش (حسب، نسب، ذات برداری وغیرہ) کے اعتبار سے انسان اور انسان میں فرق۔ امارت اور غربت کے لحاظ سے انسانوں میں تمیز۔ کسب و ہنر اور پیشوں کے اعتبار سے انسانوں میں تفریق اس پیدائشی حق کے خلاف ہے۔ مختصر الفاظ میں، انسان کی تذلیل، خواہ کسی جہت سے ہو، اس حق کی خلاف ورزی ہے۔ ''آدمیت، احترام آدمی'' قرآن کا پہلا اصول ہے اور ہر انسان کا اولین بنیادی حق، بلا مشروط۔

2۔ جنسی مساوات:

قرآن کریم کی رو سے، جنسی تفریق نہ وجہ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں سے افضل ہیں، اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی بنا پر،

مردوں سے کمتر۔ زندگی کی ابتداء، نفس واحدہ سے ہوئی ہے۔(4:1) قرآن کا ارشاد ہے۔ ہر انسانی بچہ میں ۔ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ عورت کا۔ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى (49:13) اس لیے نہ مرد، عورتوں سے الگ کوئی نوع ہیں، نہ عورتیں، مردوں سے الگ کوئی جنس۔ دونوں نوع انسان کے افراد ہیں، اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے، اس میں مرد اور عورت، دونوں یکساں طور پر شریک ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لیے کھلے رکھیں جائیں، اور دوسرے پر بند کر دیئے جائیں۔ حیاتیاتی طور پر۔۔۔(Biologically) مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لیے یکساں ہے، اور عمل کے نتائج بھی یکساں لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ ۔۔۔(3:195) تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر ضائع نہیں ہوسکتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔۔۔ مرد اور عورت کی تخصیص کے معنی کیا ہیں؟ تم ایک دوسرے کے اجزاء ہو۔ تم خلقت کے اعتبار سے ایک ہو۔۔ زندگی کے تمام معاملات میں یکساں طور پر شریک رہتے ہو۔ تم ایک نوع کے فرد ہو۔ پھر آیات (33:35) و (9:71) میں دیکھئے۔ قرآن کریم کس طرح مردوں اور عورتوں کو زندگی کے ہر میدان میں دوش بدوش گامزن بناتا ہے۔

لہٰذا، جنسی مساوات، انسانیت کا بنیادی حق ہے جسے کسی صورت میں بھی غصب نہیں کیا جاسکتا۔ قرآنی معاشرہ اس حق کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

3۔ مدارج علیٰ قدرِ اعمال:

احترام آدمیت کے بعد، معاشرہ میں مختلف افراد کے مدارج کا سوال سامنے آتا ہے اس کے لیے اصول یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔۔(46:19)۔ ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ، اس کے اعمال و کردار کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ یعنی سب سے پہلے ہر انسان کی عزت بحیثیت انسان ہوگی، اور اس کے بعد اس

کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار کو دیکھا جائے گا، اور ان کے مطابق سوسائٹی میں اس کا مقام اور درجہ مقرر کیا جائے گا۔ جو جتنی زیادہ خوبیوں کا مالک، وہ اتنے ہی اونچے مقام کا مستحق۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط ... (49:13) جو سب سے زیادہ حسنِ عمل کا پیکر، وہ سب سے زیادہ واجب العزت۔ نیچے سے لے کر اوپر تک، عزت کا ہر مقام ہر شخص کے لیے کھلا ہوگا، جسے وہ، اپنی قابلیت اور حسن سیرت کی رو سے بطور حق حاصل کر سکے گا۔ اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، نہ ہی تعینِ مدارج کا کوئی اور معیار مقرر کیا جا سکتا ہے۔

4۔ حق آزادی:

''آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔'' یہ نعرہ اور اعلان تو آپ نے ہر جگہ سے بلند ہوتا سنا ہوگا لیکن اس کا صحیح مفہوم بہت کم سامنے آیا ہوگا۔ جس جگہ سے آپ نے یہ نعرہ بلند ہوتے دیکھا ہوگا، وہیں سے آپ نے آئے دن ایسے احکام نافذ ہوتے بھی دیکھے ہوں گے جو ہر شخص کی آزادی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے جائیں۔ لہٰذا، یہ بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اگر آزادی، انسان کا پیدائشی حق ہے، تو پھر اس پر یہ پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رو سے عائد کی جاتی ہیں اور قانون کی رو سے عائد کردہ پابندیاں، انسانی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔ اس لیے کہ اگر پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔۔۔ لہٰذا صحیح آزادی کے لئے قانونی پابندیاں لاینفک ہیں۔ یہ درست ہے کہ معاشرہ کے قیام اور افراد کی حفاظت کے لیے قانونی پابندیاں ضروری ہیں، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ ارباب اقتدار، جنہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جس قدر ظلم اور زیادتی، قانون کے پردے میں کر سکتے ہیں، لاقانونیت کا استبداد اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ لاقانونیت کے دور میں یہ استبداد کھلے بندوں ہوتا تھا، اور اس دورِ دستور و آئین میں یہ، قانون سازی کی رسم ادا کر لیتا ہے، اور پھر یہ، شاہ مدار کی بسم اللہ پڑھ کر پھونکی ہوئی چھری، جس جانور کے گلے پر پھیر دی جائے وہ ذبیحہ حلال قرار پا جاتا ہے۔ یہ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے جس کا دنیا کو آج تک خاطر خواہ حل نہیں مل سکا کہ انسانی آزادی اور

قانونی پابندی میں ایسی مفاہمت کی صورت کس طرح پیدا کی جائے کہ قانونی پابندیاں بھی اپنی جگہ پر قائم رہیں اور افراد کے حقوق بھی پامال نہ ہوں۔ اس کا حل قرآن نے بتایا۔ اس نے اس ضمن میں، پہلے یہ واضح کر دیا کہ۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ... (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوت بھی کیوں نہ ملی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اس کے محکوم اور تابع فرمان ہو جائیں۔

قرآن کے اس اعلان عظیم نے انسانی آزادی کا ایسا منشور عطا کر دیا جس کا تصور بھی ذہن انسانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو رہی کامل آزادی کی شکل اب قانونی پابندی کو دیکھئے۔ اس کے لئے اسی آیت میں پہلے مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہہ کر یہ بات سمجھائی گئی کہ افراد کی آزادی پر پابندیاں لگانا تو ضروری ہیں لیکن یہ پابندیاں کوئی انسان نہیں لگا سکتا۔ اس کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کی طرف سے یہ پابندیاں کس طرح لگائی جائیں گی؟ کیا یہ وہی تھیا کریسی ہوگی جس میں مذہبی پیشوائیت، خدا کے نام کی آڑ میں، ہر قسم کی من مانی کرتی ہے؟ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ تھیا کریسی تو استبداد کی بدترین شکل ہے، اسی لیے اس نے فرعون کے ساتھ ہامان کو بھی برابر کا مجرم قرار دیا ہے جو مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ تھا۔ قانونی پابندیوں کے لیے اس نے کہا کہ:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (3:79)

خدا نے ان حدود اور پابندیوں کو، جو انسانی آزادی پر عائد کی جائیں گی، اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا کہ ان پابندیوں میں کسی قسم کی کمی بیشی کر سکے یا ان کے علاوہ کوئی اور پابندی عائد کرے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو یہ اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی کو اپنا محکوم اور تابع فرمان (چہ جائیکہ غلام) بنا

سکے۔ اب رہا یہ کہ کتاب اللہ میں بیان کردہ حدود اور پابندیوں کی عملی تشکیل اور تنفیذ کی صورت کس طرح متعین کی جائے۔ تو اس کے لیے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ حق بھی کسی خاص گروہ اور جماعت کو نہیں دیا گیا، بلکہ یہ تمام افراد معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ امور ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔۔۔(42:38) یہ حق مشاورت بھی، بنیادی حقوق کی فہرست میں داخل ہے، جس میں مرد اور عورت، امیر اور غریب، سب شریک ہیں۔ اس مشاورت کی عملی مشینری، اپنے اپنے حالات کے مطابق، خود مرتب کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا، قرآن نے، یا تو وہ قوانین دے دیئے ہیں جن کی پابندی کی جائے گی اور یا وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے افراد معاشرہ، باہمی مشاورت سے وقتاً فوقتاً قوانین مرتب کر سکیں گے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے، یا ان کے علاوہ، اور حدود و قیود متعین کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مترادف ہوگا جس کی اجازت کسی انسان کو نہیں دی جا سکتی۔ اسے وہ شرک قرار دیتا ہے۔ سورہ شوریٰ میں ہے۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۔۔۔(42:21) کیا ان کے کوئی اور شریک ہیں جو ان کے لیے دین خداوندی میں ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی؟ لہٰذا، انسانی معاشرہ کے لیے کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کی اجازت قرآن کریم نے نہ دی ہو۔

یہ ہے وہ طریق جس سے، قرآن کریم، انسانی آزادی پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دیتا، اور معاشرہ میں لاقانونیت بھی نہیں پھیلنے پاتی۔ یہ قرآن کے منشورِ حقوقِ انسانیت کی منفرد خصوصیت ہے۔

5۔ حقِ محنت:

قرآن کا ارشاد ہے کہ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ۔۔۔(39/70) ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا، نہ اس میں کمی، اسی سلسلہ میں اس نے، دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ:

لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝۳۹ ۔۔۔(53:39)۔بجز ان لوگوں کے جو کام کرنے سے معذور ہوں (جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)، کوئی شخص محنت اور کوشش کے بغیر، کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔یعنی اس معاشرہ میں، ایسے خون آشام طبقہ (Parasites) کے لیے قطعاً گنجائش نہیں ہوگی جو دوسروں کی محنت پر تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کریں اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی محنت کو سلب (Exploit) نہیں کر سکے گا، تو ہر کام کرنے والا، اپنی محنت کے پورے ماحصل کا حقدار ہوگا۔اس اصول کی رو سے نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے جس کا وجود ہی دوسروں کی محنت کے ماحصل کو غصب کرنے پر ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! جو کام کرنے کے قابل ہونے کے باوجود دوسروں کی محنت کے ماحصل پر زندگی بسر کرتا ہے، وہ گداگر ہے، خواہ کتنا ہی بڑا دولت مند کیوں نہ ہو۔

6۔عدل واحسان:

اس کا نام عدل ہے۔یعنی ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔قرآن کی رو سے عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کے حقوق کا تحفظ شامل ہے۔جسے قانونی عدل کہتے ہیں، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی حق غصب ہوتا ہو، تو عدالت کی مشینری اسے وہ حق دلا دے۔عدل کے معاملہ میں، قرآن اتنا محتاط اور جزرس ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دیکھنا! اس باب میں دوست اور دشمن میں تمیز نہ کرنے لگ جانا۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی طرف سے دشمنی کا برتاؤ تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اِعْدِلُوْا ۟ ۔وہ کچھ بھی کریں، تم ان کے ساتھ ہمیشہ عدل کرو۔اس لیے کہ یہ ادلے بدلے کی بات نہیں، یہ انسان ہونے کی حیثیت سے ان کا حق، اور اس کی ادائیگی تمہارا فریضہ ہے۔هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔۔۔(5/8)

قانونی عدل سے مراد ہے۔خدا کے مقرر کردہ قوانین وحدود کے مطابق، نزاعی امور کا فیصلہ کرنا جب قرآن کریم نے حق حکومت کسی انسان کو نہیں دیا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے قانون سازی کا حق کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو نہیں دیا۔عدل، قوانین خداوندی کی

تنفیذ کا نام ہوگا۔ اگر مملکت کا کوئی قانون، قرآنی ضابطہ کے خلاف ہوگا تو مملکت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اسے بدلوائے اور مملکت کا فریضہ ہوگا کہ اسے تبدیل کرے۔

لیکن، قرآن، عدل تک نہیں رہتا۔ اس سے بھی آگے جاتا ہے (جیسا کہ ابھی ابھی کہا جاچکا ہے) عدل سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کسی کا واجب (DUE) ہو، وہ اسے دے دیا جائے لیکن اگر اس سے کسی کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو۔ اس میں کمی رہ جاتی ہو، تو پھر کیا ہو، قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ۔۔۔(16:90) اس صورت میں، تم اس کی کمی کو پورا کرکے، اس کے، اور خود معاشرہ کے توازن کو بگڑنے سے بچالو۔ اسے احسان کہتے ہیں یہ بھی بنیادی حقوق انسانیت میں شامل ہے۔ دنیا، ایسے مواقع پر خیرات کی تلقین کرتی ہے، لیکن خیرات سے جس طرح شرف انسانیت پامال ہوتا ہے، اور خیرات لینے والے کی عزت نفس جس طرح مجروح ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس لیے قرآن نے احسان، کو خیرات نہیں قرار دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کی کمی رہ جائے، وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب وذرائع بطور حق طلب کرسکتا ہے۔ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۲۵﴾۔۔۔(70:24-25) وہ لوگ، جن کی محنت سے ان کی ضروریات پوری نہ ہوں یا جو محنت کرنے سے معذور ہوں، ان کا، ان لوگوں کے مال میں حق ہے جن کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ ہے اور یہ حق ڈھکا چھپا نہیں قرآنی معاشرہ میں سب کو معلوم ہے۔ افراد کی ہر قسم کی کمی پوری کرنے کو، بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل کرنا قرآن کے سوا آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا۔

7۔ رزق کا حق:

انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کی زندگی کا مدار، سامان زیست پر ہے۔ دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے سامان زیست خود پیدا یا مہیا کرے لیکن قرآن کریم اس باب میں ساری دنیا سے منفرد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا۔۔(11:6) دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق یعنی سامان زیست کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں خود نظام مملکت کی ہوجاتی ہیں لہٰذا، یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے اور وہ تمام افراد معاشرہ سے اعلانیہ کہ دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۚ ۔۔۔(6:151)۔ہم تمہاری ضروریات زندگی پوری کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں او رتمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔ بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا، ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ قرآنی نظامِ معاشرہ سے ہر وقت طلب کرسکتا ہے یہ حق آپ کو دنیا کے کسی چارٹر میں نہیں ملے گا۔

اس کی وضاحت میری کتاب نظام ربوبیت میں ملے گی۔

جہاں تک اولاد کے لیے رزق مہیا کرنے کا تعلق ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم وتربیت بھی شامل ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ ۔۔۔(6/152)۔اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کردو تو اس میں ''قتل'' کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں۔اس سے مراد علم وتربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔لہٰذا، قرآنی معاشرہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ تعلیم وتربیت ہو۔ بنابریں، قرآن کی رو سے، سب بچے، عمدہ پرورش اور صحیح تعلیم وتربیت بطور اپنے حق کے طلب کر سکتے ہیں، اور کوئی انہیں اس حق سے محروم نہیں کرسکتا۔

8۔جان کی حفاظت:

لیکن ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری سے پہلے، انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت سامنے آتی ہے۔قرآن نے اس باب میں واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ۔۔۔(6:152) خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لیے کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔ ہاں! اگر حق کا تقاضا ہو تو ایسا کیا جاسکتا ہے! حق کے تقاضے کے کیا معنی ہیں، اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان

کر دیا کہ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط ۔۔۔اگر کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے، تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جاسکتی ہے یا اگر کوئی شخص معاشرہ کے نظام عدل وامن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے، اور کسی طرح، اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے تو اسے بھی موت کی سزا دی جاسکتی ہے۔ ایسی صورتوں کے علاوہ، اگر کوئی کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا، پوری نوع انسان کو تلف کر دیا ہے اس کے برعکس وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ط ۔۔۔(5:32) جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوع انسان کی جان بچالی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جن مخصوص حالات میں قرآن کریم نے، کسی انسان کی جان لینے کی اجازت دی ہے۔ (یعنی قانون کی رو سے سزائے موت) وہ بھی درحقیقت عالمگیر انسانی حقوق کی مخالفت کے لیے ہے اسی کو بالحق کہا گیا ہے۔

9۔ مال کی حفاظت:

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی بنیادی حقوق میں داخل ہے جو، قانون خداوندی کی رو سے، افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ دوسروں کی ان چیزون کو ناجائز طور پر اپنے تصرف میں لے آئے اسی لیے فرمایا کہ لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ ۔۔۔(4:29) تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ ''مال'' ایک جامع اصطلاح ہے۔ جس میں ہر قسم کی مقبوضات آجاتی ہیں اور اس کا تحفظ ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔

یہاں سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے اگر کسی کے ہاں چوری ہو جائے یا ڈاکہ پڑ جائے، تو دنیا کے مروجہ نظام عدل کی رو سے مجرم کو سزا دے دی جاتی ہے لیکن جس کا مال چلا گیا تھا، اس کے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ اگر یہ نقصان اس کی اپنی غلطی۔ تساہل یا تغافل کی وجہ سے نہیں ہوا، تو اس کی تلافی کا وہ حقدار ہوگا اس اصول کا اطلاق، تا بحد امکان دیگر قسم کے

نقصانات پر بھی ہوگا۔

10۔سکونت کی حفاظت:

جان اور مال کی حفاظت کے بعد، قرآن کریم، ہر فرد کی سکونت کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔اس نے یہودیوں کے خلاف جو فرد جرم مرتب کی ہے اس میں یہ بھی کہا ہے کہ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَ تُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ ۔۔۔(2:85)تم وہ ہو، جو اپنے لوگوں کو ناحق قتل کر دیتے ہو، اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔لہٰذا، افراد معاشرہ کو سکونت مہیا کرنا مملکت کا فریضہ ہے اور کسی کو بے گھر، بے در، بنا دینا، اس کے اس بنیادی حق کو غصب کر لینا ہے۔

11۔عصمت کی حفاظت:

عصمت، انسان کی بے بہا متاع ہے یہ وہ بلند ترین قدر ہے جو صرف انسان کا خاصہ ہے حیوانات میں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔جنسی اختلاط ایک طبیعی جذبہ ہے جس میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں۔لیکن عصمت کا جذبہ صرف انسانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے لہٰذا قرآن کریم اس حفاظت کو مستقل حق انسانیت قرار دیتا ہے اسی لئے اس نے اس حق کی پامالی کو ایک ایسا جرم قرار دیا ہے۔جس کی سزا بڑی سخت ہے۔اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيۡ فَاجۡلِدُوۡا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا مِائَةَ جَلۡدَةٍ ۔۔۔(24:2)زانی مرد ہو یا عورت۔انہیں سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

صرف جرم زنا کا ارتکاب ہی نہیں۔اس کے نزدیک، شریف عورتوں کے خلاف تہمتِ بے جا بھی سنگین جرم ہے۔جس کی سزا اسی کوڑے ہے(24:4)اس لیے کہ اس سے بھی ان کی عصمت پر حرف آجاتا ہے۔

اور شریف زادیوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا۔ان کے خلاف طعن آمیز اور اضطراب انگیز باتیں پھیلا کر لوگوں کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کرنا، اس کے نزدیک، اس سے بھی بڑا جرم ہے اس جرم کی پاداش میں، اس نے کہا ہے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے انہیں حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف وارنٹ بلا ضمانت

جاری کر کے انہیں گرفتار کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں قتل کیا جائے اس طرح کہ ان کی پارٹی کا کوئی بھی فرد سزا سے بچنے نہ پائے۔ وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿٦١﴾ ... (33:61) یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے متعلق کہا کہ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٦٢﴾ (33:62) یہی قانون، خدا نے اقوام سابقہ کو بھی دیا تھا اور یہ ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ان تمام حقوق کی حفاظت مملکت کا فریضہ ہے۔

12۔ شادی میں انتخاب کا حق:

تعلق زوجین کے سلسلہ میں، قرآن کریم نے اس امر کی صراحت بھی کر دی ہے کہ شادی میں، اپنی مرضی سے انتخاب بھی بنیادی حق ہے۔ اس نے مردوں سے کہا کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ... (4:3) تم اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کرو۔ دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حق انتخاب کی حفاظت کر دی کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ ... (4:19) تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔

اس سلسلہ میں، ضمناً اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، معاہدہ نکاح کے بعد، خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوتی ہیں۔۔۔ صرف ایک بات میں مرد کو رعایت دی گئی ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ طلاق (یا بیوگی) کی۔۔۔ صورت میں، عورت کو عدت کی مدت میں نکاح ثانی کی اجازت نہیں ہوتی اور مرد کے لیے کوئی عدت نہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے یعنی اس دوران میں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عورت حمل سے تو نہیں یہ حکم، پیدا ہونے والے بچے کے حق کی حفاظت کے لیے ہے۔ یعنی یہ متعین کرنے کے لیے کہ وہ کس کا بیٹا ہے سورہ بقرہ میں ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ ... (2:228) عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس میں مرد کو ایک خصوصی درجہ حاصل ہے اور وہ یہ کہ اسے عدت نہیں گزارنی پڑتی۔

ان حقوق کا تحفظ مملکت کا فریضہ ہے۔

13۔ حسنِ ذوق کا حق:

قرآن، انسان کے انفرادی حسنِ ذوق (Aesthetic Taste) کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے، اس حق سے محروم کر دے۔ اس نے بڑی تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ --- (7:32) ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لیے بنایا ہے، اور خوشگوار سامان زیست کو، حرام قرار دے؟ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، ان سے لطف اندوز اور کیف یاب ہونا، ہر فرد کا بنیادی حق ہے جس سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اصولاً یہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا، اسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مترادف ہے جس کا حق کسی انسان کو نہیں پہنچتا۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کھانے پینے کے انداز اور رہنے سہنے کے طریق پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق حق انتخاب دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں سے جس کے ہاں جی چاہے کھاؤ پیو، اور خواہ اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ، اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ ---(24:61) اسی طرح وہ لباس کے معاملہ میں بھی وضع قطع اور تراش خراش پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا اور ہر ایک کے حس ذوق کی رعایت رکھتا ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی کے علاوہ، زینت بھی ہے: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ ---(7:26) وہ سونے کے زیورات، چاندی اور شیشے کے برتن، باریک اور دبیز ریشمی ملبوسات، اعلیٰ درجے کے صوفے (76:13-15, 18:31) اور اسی قسم کا دیگر سامان آرائش و زیبائش، جنتی زندگی کا خاصہ قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بہ ہیئتِ مجموعی معاشرہ کا تمدنی میعار اتنا بلند ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں تمام افراد معاشرہ کو میسر ہوں۔ جنّتی زندگی میں یہ نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان

آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے۔ جنّتی زندگی میں جو کچھ کسی ایک فرد کو میسر ہوگا، وہی کچھ دیگر افراد کو میسر ہوگا۔

14۔ مذہبی آزادی:

مذہب کے معاملہ میں قرآن کریم میں ہر انسان کو پوری پوری آزادی ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے، صداقت کو، عقل وفکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔۔۔ لہٰذا اس میں جور واکراہ کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔۔۔ (18:29) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور وفکر کرو، اور اس کے بعد، جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اس کے لیے تجویز کیا گیا ہے لیکن انسان کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے اسے راستہ دکھادیا گیا ہے اور اس کے بعد، یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے یا اس سے انحراف برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں میں گزرے گی۔ اس سے سرتابی برتے گا، تو نقصان اٹھائے گا اگر اسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کردیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے اب یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی کہ اسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ قرآن میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۔۔۔ اگر تمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبوراً چلایا جائے۔ تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا، وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب، آنکھ بند کیے، بھیڑ بکریوں کی طرح، اسی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے انسان کو ایسا پیدا نہیں کیا۔ اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (10:99) تو کیا تو

انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں۔ یہ تو مشیت خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس لیے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔ اس سے زیادہ کا تو مکلف نہیں۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ ۔۔۔(2:256)۔ غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متمیّز ہو کر سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد، دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام مذہب نہیں (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا) اس لیے وہ مذاہب عالم میں سے کسی کو اپنا حریف نہیں قرار دیتا وہ ایک دین، یعنی ضابطہ زندگی یا مملکتی نظام ہے۔ وہ اس کی اجازت تو نہیں دے سکتا کہ اس کی حدود مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظام مملکت قائم کریں۔ یہ تو ''ریاست درونِ ریاست'' (State with in state) قائم کرنے کے مترادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی لیکن وہ اس سے بھی کچھ تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدود مملکت میں رہنے والے اپنے لیے مذہب کون سا پسند کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز، یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے وہاں، تمام اہل مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی حفاظت اپنے ذمے لیتا ہے۔ وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجہ جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔۔۔(22:40) اگر اللہ انسانوں کے ذریعے، سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا، تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں۔ عیسائیوں کے گرجے۔ دیگر اقوام کی پرستش گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت خدا کا نام لیا جاتا ہے ڈھا دی جاتیں۔ لہٰذا، ان تمام معبدوں کی حفاظت، قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے، جس کا ہر غیر مسلم، بطور اپنے حق، کے مطالبہ کر سکتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعت مؤمنین سے تاکیداً کہا ہے کہ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔۔۔(6:108) تم، غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔ تم ایسا کرو گے تو وہ، اس کے جواب میں بر بنائے جہالت، اللہ کو گالی دے دیں گے۔ سو جس طرح تمہیں یہ برا

لگے گا، اسی طرح انہیں، ان کے معبودوں کو تمہارا گالی دینا بھی برا لگتا ہے اصل یہ ہے کہ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۔۔۔(6:108) ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔ تم ان تک حق کی بات پہنچاؤ۔ جب یہ بر بنائے علم و بصیرت، غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے، تو خود بخود، اپنے معبودان باطل کو چھوڑ کر، صحیح نظام زندگی اختیار کر لیں گے۔ تم ان سے مجبوراً ایسا نہیں کرا سکتے۔

لہٰذا، قرآن، نوعِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

اس مقام پر میں، اپنے موضوع سے ذرا سے گریز (Digression) کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ خدا نے تو مذہب کے معاملہ میں انسان کو اس قدر آزادی عطا کی ہے، لیکن ہمارے ارباب شریعت کا فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کو تو اس کا حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ چاہے اپنے مذہب پر رہیں اور چاہے اسے تبدیل کر لیں۔ لیکن ایک مسلمان کو اس کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اگر مسلمان مذہب تبدیل کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا، بلکہ یہاں تک بھی کہ اگر کسی معاملہ میں اس کے خیالات ان ارباب شریعت سے مختلف ہوں اور اس بنا پر یہ اسے مرتد قرار دے دیں، تو بھی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس کی تو ہر ایک کو آزادی ہوگی کہ وہ چاہے تو الدین (اسلامی نظام) کے تحت آ جائے اور چاہے اس کے باہر (غیر مسلم) رہے۔ لیکن اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ بطیب خاطر اسلامی نظام اختیار کرے اور اس کے بعد اس نظام کے احکام میں سے جس حکم کو جی چاہے مانے اور جس سے جی چاہے انکار اور سرتابی اختیار کرے۔ اس قسم کی آزادی تو کسی ملک میں بھی مل نہیں سکتی۔ اسے مملکت کے تمام قوانین کی اطاعت کرنی ہوگی۔ ہاں! اگر وہ کسی وقت اس قسم کی اطاعت کو ناقابل قبول سمجھے، تو اسلام کو چھوڑ کر، کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔ وہ چاہے تو اسلامی مملکت میں غیر مسلم (ذمی) کی زندگی بسر کرے اور چاہے کسی اور ملک میں چلا جائے۔

اس گریز کے بعد، میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ قرآن کی رو سے، اگلا

بنیادی حق ہے:

15۔ سچی بات کہنے کا حق

قرآن کریم نے افراد کو سچی بات کہنے کا حق ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کی اس نے اسے افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا کہ وہ حق بات کہیں یا نہ کہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لیے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کریم کہاں تک جاتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لیے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس بات میں قرآن کریم کہاں تک جاتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ۔۔۔ اے جماعت مومنین! تمہارا فریضہ ہے کہ تم عدل وانصاف کو دنیا میں قائم رکھو۔ اس کے لیے بنیادی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ سچی بات بلا رورعایت کی جائے۔ اس ضمن میں تم سمجھ لو کہ جب کسی معاملہ کے متعلق کچھ کہنے کا وقت آئے تو یہ نہ خیال کرو کہ تم کسی پارٹی یا فریق کی طرف سے شہادت دینے کے لیے آئے ہو۔ تم یہ سمجھو کہ تم صرف اپنے خدا کی طرف سے شاہد بن کر آئے ہو۔ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ پھر سچی بات کہ دو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۔۔۔ خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ (آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن، انسان کو کس مقام تک لے جاتا ہے؟) اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ ۔۔۔ خواہ وہ تمہارے والدین یا دیگر عزیز رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا ۔۔۔ جس کے خلاف یہ شہادت جاتی ہے، وہ امیر ہو یا غریب، اس کی پروا مت کرو۔ اس لیے کہ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۔۔۔ اللہ کا حق ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یاد رکھو! اپنے مفاد کا تحفظ۔ عزیز رشتہ داروں کی محبت اور تعلقات اس پارٹی سے نقصان کا احتمال جو دولت مند ہے، یہ تمام جذبات تمہاری راہ روک کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ ۔۔۔ تم ان جذبات کا اتباع قطعاً نہ کرو اور ہمیشہ عدل کے تقاضے کو ملحوظ رکھو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۳۵﴾ (4:135) نہ ہی تم توڑ مروڑ کر، ذو معنی بات کرو اور نہ ہی اس سے پہلو تہی

کرو۔ ایسا کرنے سے ہوسکتا ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو دھوکا دے سکو، لیکن تم اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس لیے سچی بات کہنے کے لیے دھڑلے سے سامنے آؤ اور، لگی لپٹی بغیر، صاف صاف دوٹوک بات کرو۔

ادھر یہ کہا اور دوسری طرف معاشرہ سے تاکید کی کہ اس کا انتظام کرو کہ شہادت دینے والے کو، کوئی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ (2:282)۔

16۔ اظہار خیال کا حق:

اظہارِ خیال کا حق بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے انسان اور حیوانات میں ایک بنیادی فرق یہ بھی بتایا ہے کہ حیوانات، اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی (انسانوں کی طرح) صلاحیت نہیں رکھتے اور انسانوں کو اس کی صلاحیت اور استعداد دی گئی ہے۔ فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ (55:3-4) خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے قوت گویائی (یا اظہار خیال کی صلاحیت) عطا کی۔ دوسری جگہ ہے الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ ۔۔۔ (96:4) خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے بھی اظہارِ خیال کی صلاحیت عطا کی۔ یعنی، زبان یا قلم کے ذریعے اظہار خیال کا حق اسے، انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔

واضح رہے کہ اظہار خیال (یا خدا کی عطا کردہ کسی اور صلاحیت) کا خلاف قانونِ خداوندی، استعمال، جرم قرار پائے گا اور مستوجب سزا۔ لیکن کسی صلاحیت کے خلاف قانونِ خداوندی، استعمال کو جرم قرار دینا، اور بات ہے اور اس حق کو سلب کر لینا، اور بات۔ ان صلاحیتوں کے غلط استعمال کو جرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے حقِ استعمال کو سلب نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنا تو انسان کو حیوان بنا دینے کے مترادف ہوگا۔

17۔ رازوں کی حفاظت کا حق:

قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے کہ کسی کے رازوں کی خوامخواہ ٹوہ لگائی جائے اس کا ارشاد ہے: وَّلَا تَجَسَّسُوْا ۔۔۔ (49:12)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ افراد کو اس کی ضمانت دیتا ہے کہ ان کے راز، افشا نہیں کیے جائیں گے۔ (جرائم کی تحقیق کے سلسلہ میں ایسا کرنا کچھ او

رمعنی رکھتا ہے) خط و کتابت کی حفاظت کا حق بھی اسی ذیل میں آجاتا ہے اسی طرح وہ، ہر شخص کو پرائیویسی کا حق بھی دیتا ہے جب کہتا ہے کہ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا ۔۔۔(24:27)۔

18۔حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق:

جس چیز کو عام طور پر حیثیتِ عرفی کہا جاتا ہے، قرآن اس کی حفاظت کا بھی حق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ۔۔۔(4:148) اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بری بات کو خوامخواہ اچھالا جائے۔اس کی اصطلاح مطلوب ہو تو خاموشی سے ایسا کیا جائے۔۔۔۔ پھر ارشاد ہے کہ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ۔۔۔(49:11) کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کا مذاق نہ اڑائے۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط ۔۔۔کسی کے الٹے پلٹے نام نہ رکھے جائیں۔محض ظن اور گمان کی بنا پر کسی کو مطعون نہ کیا جائے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز ۔۔۔(49:12) اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہوجائے، اسے مجرم نہ سمجھا جائے، بلکہ کہا یہ جائے کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ⑫(24:12) هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ⑯(24:16) اور یہی نہیں کہ ظن اور قیاس کی بنا پر، کسی کے سامنے اس کی برائی نہ کی جائے، بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ایسا نہ کیا جائے کہ یہ غیبت ہوگی اور غیبت سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط ۔۔۔(49:12) اس قسم کے تاکیدی احکامات سے، قرآن، افراد کی حیثیتِ عرفی کا تحفظ کرتا ہے۔

19۔امن کی ضمانت:

ان تمام حقوق سے آگے بڑھ کر، قرآن کریم یہ ضمانت دیتا ہے کہ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ㊳۔(2:38) انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔خوف خارجی خطرات کی طرف سے اندیشہ کا نام ہے۔لہٰذا، اس معاشرہ میں، ہر فرد، ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ ہوگا اور حزن، اس افسردگی کو کہتے ہیں جو پریشانیوں کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے لہٰذا، جہاں اس معاشرہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ، بیرونی خطرات سے امن میں

رہیں، وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ ان پریشانیوں کو دور کرے جو لوگوں کے لئے وجہ افسردگی بنتی ہیں۔ خوف اور حزن سے مامونیت، ایسی جامع کیفیت ہے جس میں داخلی اور خارجی، ہر قسم کے اندیشوں اور پریشانیوں سے حفاظت کا تصور آجاتا ہے۔ اسی حفاظت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۔۔۔ (6:164) اس میں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا یہ نہیں ہوگا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ ذمہ داری کسی کی ہو اور اسے سرانجام کوئی اور دے، کام کسی کا ہو اور مفت میں بے گار کوئی اور بھگتے جرم کسی نے کیا ہو اور دھڑکا کسی اور کو لگا ہوا ہو۔ یہ ہے امن کی وہ ضمانت جس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کا حصول ہر فرد معاشرہ کا بنیادی حق ہے۔

حقوق کا موازنہ:

یہ ہیں، وہ بنیادی حقوق جنہیں قرآن، حقوق انسانیت کی حیثیت سے تسلیم کرتا، اور جن کی ضمانت قرآنی معاشرہ دیتا ہے۔ یہ صرف بڑے بڑے حقوق کی فہرست ہے ورنہ چھوٹے چھوٹے کئی اور حقوق ہیں، جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ آپ ان حقوق کو سامنے رکھئے، اور پھر ان کا موازنہ ان حقوق سے کیجئے جن کا ذکر اقوام متحدہ (UNO) کے چارٹر میں کیا گیا ہے آپ پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہوجائے گی کہ انسانی فکر، اپنی (اس وقت تک کی) انتہائی بلندیوں کے باوجود، کہاں تک جاسکا ہے اور وحی خداوندی، اس باب میں، انسان کو کہاں لے جاتی ہے۔۔ اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ وحی خداوندی (قرآن کریم) نے انسانوں کو یہ حقوق اس زمانے (چھٹی صدی عیسوی) میں عطا کئے تھے جب انسان، اپنے بنیادی حقوق کے تصور تک سے ناآشنا تھا۔

کوئی حق مطلق نہیں:

قرآنی حقوقِ انسانیت کی فہرست کا، اقوام متحدہ کے مرتب کردہ منشور کے ساتھ موازنہ، کے بعد، ایک اور اہم حقیقت پر بھی غور کیجئے۔ جس زمانے میں یو۔این۔او کا منشور زیر تحقیق تھا، انجمن اقوام متحدہ کی (Educational Scienticfic and cultural

(Organization) نے (جسے عام طور پر (Unesco) کہا جاتا ہے، اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کیا اور اسے دنیا بھر کے مشہور ارباب فکر ونظر کے پاس بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کریں۔ (Unesco) نے ان میں سے بلند پایہ مشاہیر کے مقالات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جس کا تعارف (Jacques Maritain) نے لکھا تھا۔ ان مقالات میں جس بات کو نمایاں طور پر تسلیم کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے کوئی حقوقِ مطلق (Absolute) ہیں ہی نہیں۔ مسٹر (Maritain) کے الفاظ میں۔

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق، بالآخر انسانی حقوق ہیں (خدائی حقوق نہیں) اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابل ترمیم وتبدل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو بلا مشروط کہا جاتا ہے، ان میں بھی، ان حقوق کے مالک ہونے میں، اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے لیکن اس کا استعمال، ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از روئے عدل عائد کی جائیں گی۔

مشروط حقوق:

لیجیے! ایک ہی تشریح نے، بنیادی حقوق انسانیت کی رفیع الشان عمارت، دھڑام سے نیچے گرادی۔ انسان جس بات کی ضمانت چاہتا ہے۔ اور جس ضمانت سے اسے حقیقی اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کے کچھ حقوق ایسے ہیں جو اسے محض انسان ہونے کی حیثیت سے بلا مشروط حاصل ہیں۔ نہ ان حقوق میں کوئی ردوبدل کرسکتا ہے، نہ من مانی حدود و قیود عائد کرسکتا ہے لیکن جب ایک طرف، اس کے ہاتھ میں حقوق کی فہرست دے دی جائے، اور دوسری طرف اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ ارباب اقتدار (Party in Power) کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ''از روئے عدل'' ان حقوق پر جو پابندیاں چاہے عائد کردے، تو اس سے اسے خاک اطمینان حاصل ہوگا؟ وہ ارباب اقتدار کی دخل اندازی سے بچنے کے لیے ہی تو حقوق چاہتا تھا اگر وہ دخل اندازی بدستور رہے تو اسے اس قسم کے حقوق سے کیا حاصل ہوگا؟ مختلف

اقوام عالم کے ہاں، ارباب اقتدار کے ہاتھوں، ان کے حقوق کی جس قدر مٹی پلید ہوتی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ سب ''عدل وانصاف'' کی خاطر، اور آئین وقانون کے نام سے، کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے اس باب میں، بات بالکل واضح کردی۔ اس نے بیشتر حقوق کو حقوقِ مطلق قرار دیا جن پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی (مثلاً رزق، یعنی بنیادی ضروریات زندگی حاصل ہونے کا حق، احترام انسانیت کا حق، صحیح تعلیم وتربیت کا حق، عدل واحسان کا حق، تحفظِ عصمت کا حق اور اسی قسم کے دیگر حقوق جو یکسر غیر مشروط ہیں (''اور جو حقوق مشروط ہیں۔'') ان کی شرائط اور حدود کو بھی خود ہی متعین کردیا اور ان دونوں کو یہ کہہ کر مکمل اور غیر متبدل قرار دے دیا کہ ''وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ ---(6:115) تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہوگئی اب ان امور میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں اسی مکمل اور غیر متبدل ضابطہ حیات کا نام قرآن ہے، جو دنیا میں حقوق انسانیت کا واحد ضامن ہے۔

اقوام اس چارٹر پر عمل نہیں کرتیں:

یہ تو رہا ان حقوق کے مشروط اور قابل تغیر وتبدل ہونے کے متعلق جو اقوام متحدہ کے چارٹر میں مذکور ہیں۔ اس کے بعد، اس سے بھی زیادہ اہم بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ، ہر چند اس چارٹر کو اقوام عالم کے نمائندوں نے منظور اور تسلیم کیا ہے، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ قومیں اس پر عمل بھی کریں گی۔ اس ضمن میں، شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر (Qincy wright) اپنے مقالہ میں لکھتا ہے۔

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہر حال میں، حقوق انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں، اقلیتوں پر جس قدر مظالم کیے گئے ہیں اس سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ اگر مجلس اقوام متحدہ فی الواقعہ چاہتی ہے کہ ان حقوق کا احترام ہو تو اسے چاہیے کہ یہ تمام

اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے، اور اقوام عالم کے اقتدار اعلیٰ (Sovereignity) کی روشنی میں اس میں تبدیلی پیدا کرے۔

پروفیسر رائٹ، ان حقوق کے تحفظ کے لئے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اقوام عالم، اس باب میں اپنے اقتدار اعلیٰ کو، اقوام متحدہ کی تحویل میں دیدیں۔ اس کے برعکس ہمیں سیاسی افق پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ، مرحوم لیگ اوف نیشنز کی طرح، انجمن اقوام متحدہ کا وجود ہی خطرہ میں ہے۔ کئی اقوام نے انجمن کو اپنے واجبات تک ادا نہیں کیے۔

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حالات ایسے ہیں تو پھر وہ کون سی صورت ہے جس میں، ان حقوق کے احترام اور تحفظ کا خاطر خواہ انتظام ہوسکتا ہے۔ اس باب میں مسٹر (Maritain) نے اپنے تعارفی مقالہ میں جو کچھ کہا ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

پس چہ باید کرد:

انسانیت کے حقوق کی تعریف (Definition) نہیں، بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لیے، سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوق انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو ''فلسفہ زندگی'' کہتے ہیں۔

یعنی احترامِ حقوقِ انسانیت کے لیے ضروری ہے کہ تمام اقوام کا فلسفہ زندگی (یا آئیڈیالوجی) مشترک ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا تحفظِ حقوقِ انسانیت کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکے گی۔ قرآن کریم اس کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ تمام نوع انسان کے لیے اقدار (Values) کے یکساں پیمانے مقرر کرتا ہے۔ وہ عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُم مَّوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٞ لِّمَا فِي ٱلصُّدُورِ وَهُدٗى وَرَحۡمَةٞ لِّلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٥٧﴾ (10:57)

اے نوع انسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ایک ضابطہ ہدایت آ گیا ہے۔ اس میں ہر اس نفسیاتی کش مکش کا علاج ہے جو انسانوں کے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی اور

اس طرح ان کے معاشرہ میں فساد پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ جولوگ اس ضابطہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، یہ ان پر کامیابیوں اور خوشگواریوں کی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔

اس ایمان کی بنیاد اس علیٰ وجہ البصیرت یقین پر ہے کہ انسان (یا اقوام) کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون مکافاتِ عمل کی رو سے متعین ہوتا ہے، اور اسی کے مطابق اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قومیں حقوق انسانیت کا احترام اور تحفظ نہیں کرتیں، وہ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں، اور ان کا عسکری ساز و سامان، اور سیاسی مہرہ بازیاں، انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو نہ کبھی کسی کی خاطر، بدلا ہے، نہ بدلے گا۔ یہی وہ ایمان (یا فلسفہ زندگی) ہے جس سے حقوق انسانیت کا تحفظ ہو سکتا ہے۔۔۔ اسی ایمان کو ایک زندہ حقیقت بنانے اور اسے عملی پیکر میں لانے کے لیے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، تاکہ اس آزاد مملکت میں انسانی حقوق کا تحفظ ہو سکے اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ان حقوق کا تحفظ ہے، بلکہ اس کی ہستی کی وجہ جواز ہی یہ ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے طلوعِ اسلام نے تحریک پاکستان کی اس شد و مد سے حمایت کی تھی، اور یہی وہ نصب العین جس کی طرف یہ تشکیل پاکستان سے لے کر اس وقت تک مسلسل دعوت دیئے چلا آ رہا ہے۔ یہ مقصدِ عظیم اس وقت حاصل ہوگا جب اس خطۂ زمین میں، قرآنی نظام زندگی قائم ہوگا کہ وہی نظام، احترام آدمیت کا ضامن اور حقوق انسانیت کا محافظ ہو سکتا ہے۔

حرف آخر:

ہم نے اس مقالہ میں صرف حقوق کا ذکر کیا ہے (کہ اس کا موضوع یہی تھا)۔ ذمہ داریوں کا ذکر نہیں کیا۔ حقوقِ مطلق کو چھوڑ کر جس قدر حقوق ہیں وہ مشروط ہوتے ہیں، ذمہ داریوں کے ساتھ۔ بالفاظ صحیح یوں کہیے کہ ہر حق، ایک ذمہ داری کی سرانجام دہی سے ثبت ہوتا ہے۔ اسلامی نظام میں دو گروہ آباد ہوں گے۔ ایک جماعت مومنین جو اس نظام کے قیام و استحکام کی ذمہ دار ہوگی اس کی ذمہ داریاں بڑی اہم اور وسیع ہوں گی ان کا اجمالی سا تصور اس میثاق کی رو سے سامنے آ سکتا ہے جسے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے۔۔۔ یعنی جان اور مال کا

فروخت کر دینا۔ ان کے حقوق، ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ غیر مسلموں (اہل الذمہ) کا ہوگا۔ ان کی ذمہ داریاں مملکت کے آئین وقوانین کی رو سے متعین ہوں گی لیکن وہ آئین وقوانین بھی چونکہ ان حدود کے پابند ہوں گے جو خدا کی مقرر کردہ اور غیر متبدل ومعلوم ہیں، اس لیے ان غیر مسلموں کو اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوگا۔ (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) اگر وہ کسی وقت اس نظام کے تابع نہ رہنا چاہیں تو وہ کسی دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔ (قرآن کی رو سے) اس نظام کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ان کے مامن تک انہیں بحفاظت پہنچا دیں۔